© rasailojaraid.com

پشاور شہر کے دروازے: ایک تاریخی جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر فخر الاسلام*

Abstract

Peshawar is one of the oldest cities of the Subcontinent. Like other components associated with old cities, boundary wall round the city is a prominent feature of Peshawar. The city inside the wall is called "Androon-e-Shehar" or walled city. One could enter the walled city through different gates. In Peshawar those gates were 16 in number. They were given different names depending upon the kind of people and places inside or areas outside the gates. The walled city and its gates were damaged by people through encroachments. Except for few hundred feet of the wall and 4 to 5 of the gates could survive. However, people who loved culture and heritage tried not only to preserve the remaining parts but also to restore the damaged and encroached parts. Now, most parts of the wall and gates have been restored. In this paper, an attempt has been made to give full picture of the wall and its 8 gates. Besides getting information from various sources, the researcher himself visited all those areas which have been discussed in the article. Moreover a group of students also interviewed dwellers of the area.

اقتباس

پشاورکا شمار جنوبی ایشیاء کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ پرانے شہروں میں جہاں دوسری چیزیں اُن کی پہچان بن چکی ہیں وہاں شہر کے ارد گرد فصیل کی تعمیر اور اندر باہر

* ڈائریکٹر پاکستان سٹڈی سنٹر، یونیورسٹی آف پشاور۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جانے کے دروازے بھی ایک مشترکہ ورثہ بن گئے تھے۔ دوسرے شہروں جیسے دہلی، لاہور اور ملتان کی طرح پشاور کے ارد گرد دیوار اور اُن میں کل سولہ دروازے تعمیر کئے گئے تھے۔ ان دروازوں کے مخصوص نام تھے، یہ نام مختلف اسباب کی وجہ سے دئے گئے تھے یعنی یا تو دروازے جن علاقوں کی طرف کھلتے تھے وہ نام جیسے کابلی، ہشتنگری،کوہاٹی اور لاہوری دروازے یا پھر دروازوں کے آس پاس مقامات یا لوگوں کی وجہ سے جیسے ڈبگری، یکہ توت، آسیہ اور گنج وغیرہ۔ بدقسمتی سے لوگوں نے مختلف اوقات میں ناجائز تجاوزات کی شکل میں فصیل شہر اور دروازوں کے زیادہ حصوں پر قبضہ کرکے ان کو مسمار کرایا تھا۔تاہم پشاور میں ثقافت اور قومی ورثے سے محبت کرنے والوں کی کوششوں سے دیوار اور دروازوں کے زیادہ حصے واگزار کرا لئے گئے اور ان کو از سرِنو تعمیر کیا گیا۔ اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ فصیل شہر اور ۱۶میں سے ۸ دروازوں کا تفصیلی و تحقیقی حال بیان کیا جائے۔ اس مقالے کے لئے صرف طبع شدہ منابع پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ راقم خود ان علاقوں میں گیا اور یونیورسٹی کے چند طلباء و طالبات نے علاقے کے مکینوں سے انٹرویو کئے ان کے نتیجے میں ملنے والی معلومات سے بھی استفادہ کیا گیا۔

ابتدائیہ

شہروں کے گرد فصیل تعمیر کرنے کا رواج کافی پُرانا ہے۔ کہا جاتاہے کہ جب یونان میں شہری ریاست کا تصور اُبھرا تو شہروں کے گرد دیواریں بھی بننے لگیں بابل، چین، یورپ، یونان، سلطنت روم، مشرق وسطیٰ اور دیگر خطوں میں شہروں کو دیواروں میں محفوظ کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بہت زیادہ قدیم اور قرون وسطیٰ دور کے شہروں کی فصیل شہر کے ذریعے حفاظت کی جا تی تھی۔ ان دیواروں کا مقصد، جیسا کہ ذکر ہوا، شہروں کو حملہ اوروں اور دیگر خطرات سے بچانا تھا۔ پشاور شہر کا شمار بھی برصغیر کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے اس کے ارد گرد فصیل شہر اگرچہ بہت قدیم ہے مگر کہاجاتا ہے کہ اس کو موجودہ شکل میں سکھ حکمران رنجیت سنگھ کے جرنیل ابو طبیلہ نے پشاور پر سکھ دور حکومت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوران تعمیر کرایا تھا۔ سکھ دور حکومت کے بعد اس میں شکست و ریخت ہوتی رہی تاہم انگریزوں نے اس کی تعمیر و مرمت پر توجہ دی۔[۱] یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پشاور پر سکھوں کے قبضے کا مختصر حال بیان کیا جائے۔ پشاور پر سکھوں کے قبضے کا منصوبہ مشہور سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ نے تیار کیا تھا۔۱۸۱۸عیسوی تک پشاور پر افغان دُرانی خاندان کا قبضہ تھا۔اسی سال شہر سکھوں کے قبضے میں آیا۔ سولہ سال تک مغلوب افغان حکام خراج دیتے رہے مگر ۱۸۳۴ ء میں سکھوں نے اس کو دربار لاہور کے ساتھ ضم کیا۔۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد وہ پشاور پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ پائے اور اس شہر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوگیا۔[۲]

پشاور کا پرانا شہر۱۴۰۰ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔فصیل شہر کی اُنچائی ۱۵فٹ اور چوڑائی ۳ فٹ تھی۔[۳]۔دیوار کو انیٹوں اور گھارے سے بنایا گیا ہے باہر کی اطراف پر اینٹیں ہیں جبکہ اندر مٹی بھر دی گئی ہے اور آخر میں سرخ مٹی سے بنے گھارے کی لیپائی کر دی گئی ہے۔ یہ دیوار آج(۲۰۱۷) میں بھی بعض مقامات پر اپنی اصلی حالت میں موجود ہے تاہم دکھ کی بات ہے کہ متعدد جگہوں پر یہ تجاوزات کی زد میں آئی ہے۔[۴](شگفتہ شاہین۔ بالا حصار۔ص۹)

جب ہم شہر پناہ اور فصیلوں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ بات ازخود عیاں ہوتی ہے کہ شہر کے اندر آنے اور باہر جانے کے لئے دروازے بھی ہونگے۔ پشاور کے گرد تعمیر کردہ دیوار کے مختلف حصوں اور اطراف میں دروازے بنائے گے۔ ان دروازوں کے نام یا تو سمت کے لحاظ سے یا دوسرے حوالوں سے مشہور ہوئے۔ پشاور شہر میں کُل۱۶دروازے تھے۔[۵](بی بی سی ۱۶ دسمبر۲۰۱۶)جن میں سے آٹھ کی تفصیل ذیل کی سطور میں دی جارہی ہے:

۱۔ کابلی دروازہ

اس کو کابلی دروازہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس دروازے سے نکل کر قافلے کابل کی طرف جاتے اور وہاں سے اس طرف آتے تھے۔ اس دروازے کی خاص بات یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے اندر داخل ہو تے ہی مشہور''قصہ خوانی''بازار شروع ہوتا ہے۔ یہ بازار افغانستان، وسط ایشیاء اور دیگر علاقوں سے آنے والے تجارتی قافلوں کے ٹھہرنے کی جگہ تھی۔ یہاں پر جب تاجر اور ساربان رات کو جمع ہوتے تھے توقصے کہانیا ں سناتے تھے اسی نسبت سے اس کا نام قصہ خوانی پڑگیا۔٦(سید عبدالقدوس۔صفحہ نمبر۱۸۹) اسی علاقے سے متصل ڈھکی نعلبندی، محلّہ خداداد،بازار ہزازاں، بٹیربازاں، سبزی منڈی اور موچی لڑہ کے علاقے ہیں۔ قصہ خوانی سے کئی گلیاں دائیں بائیں جانب نکلتی ہیں۔ قصہ خوانی کی ایک اور وجہ شہرت ۲۳اپریل ۱۹۳۰ء کو یہاں رونما ہونے ولا خونی واقعہ تھا جب انگریز فوج نے مظاہرین پر گولی چلادی جس کے نتیجے میں متعدد افراد شہید ہو گئے۔۷(اپنی کتاب سے تفصیل)واقعے کے ۹سال بعد۱۹۳۹ء میں قصہ خوانی کے وسط میں ان شہداء کی یادگارتعمیر کی گئی جو آج تک قائم ہے۔ یاد گار کی تعمیر کافیصلہ پشاور شہر کی میونسپل کمیٹی نے کیا تھا۔۸(زاہدہ ظفر رنفرنس نمبر۱۶)

کابلی دروازے کے آس پاس بڑے جلسے بھی ہوتے رہے یہاں منعقدہ جلسوں سے برصغیر پاک و ہند کے اہم رہنماؤں محمد علی جوہر،جواہر لال نہرو،عبدالغفار خان، مولانا مفتی محمود،میاں طفیل محمد، نوابزادہ نصر اللہ خان، خان عبدالولی خان، محمد اشرف خاکسار، قاضی حسین احمد، عبیداللہ سندھی اور کئی دیگر شخصیات نے خطاب کیا۔۹(تمثیلاصفحہ نمبر۴۶)کابلی دروازے سے متصل باہر کی طرف خیبر بازار واقع ہے جس میں کتابوں کی مشہور دکان''یونیورسٹی بک ایجنسی''واقع ہے۔ اسی بازار میں اسلامیہ کلب بلڈنگ ہے جو تاریخی اسلامیہ کالج پشاور کی ملکیت ہے۔بازار کے ایک سرے پر سوئیکارنو چوک ہے جو انڈونیشیاء کے عظیم لیڈر سوئیکار نو کے نام سے موسوم ہے۔

> "یہ علاقہ اپنے قدیمی بازار اور قدیمی عمارات کی وجہ سے مشہور ہے۔ مجھے اس لئے پسند ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ اور یہاں مختلف لوگوں سے ملنا پڑتا ہے اور مختلف لوگوں سے مل کر مزا آتا ہے۔ یہاں کاروبار، تعلیم اور صحت کے مسائل دوسرے علاقوں سے اچھے ہیں۔9-A"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ باجوڑی گیٹ

اگر چہ اس کے نام سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ یہ دروازہ باجوڑ ایجنسی کی طرف کھلتا تھا اس لیے اس کو باجوڑی گیٹ کہا گیا تاہم یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ باجوڑ شہر کے شمال مغرب میں واقع ہے جس کی طرف ہشتنگری اور دیگر دوازے کھلتے ہیں۔ اس دروازے کو جہانگیر پورہ دروازہ بھی کہتے ہیں جو کہ قابل فہم ہے کیونکہ اس کے قریب مشہور بازار جہانگیر پورہ واقع ہے۔ یہ گیٹ اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں۔ تاریخ پشاور کے مصنف گوپال داس کے مطابق اس دروازے کو پشاور کے ڈپٹی کمشنر میکسن نے گرایا تھا۔۱۰(گوپال داس نمبر34)اس علاقے میں جہانگیرپورہ میں رہائش اختیار کرنے والی ماریہ سے انیس الرحمان نے انٹرویو کیا۔ ماریہ نے کہا:

> "ہم مردان سے پشاور منتقل ہوئے تقریباً ۱۵ سال سے رہ رہے ہیں۔اس علاقے کے رسم ورواج میں شادی کے رواج میں مہندی کی رسم بہت نمایا ں ہے۔یہ علاقہ پشاوری چپل اورگرم کپڑوں اور کوٹوں کے لئے بہت مشہور ہے۔ مجھے یہ علاقہ بے حد پسند ہے۔اس علاقے کے مسائل میں سر فہرست کوڑا کرکٹ کی بہتات ہے۔ 10-A"

باجوڑی دروازے کے اندر مشہور بازار نمکمنڈی واقع ہے۔ اس بازار کو نمک منڈی اس لئے کہتے ہیں کہ کوہاٹ اور بنوں سے تاجر معدنی نمک لاکر یہاں بیچتے تھے۔ اس بازار کی ایک اور وجہ شہرت یہ ہے کہ تحریک خلافت کے دوران ۱۹۲۰ء میں جب ہندوستان بھر سے لوگ ہجرت کی خاطر پشاور آئے تو شہر کے لوگوں نے ان کو یہاں ٹھرایا۔۱۱ (اپنی کتاب سے مزید تفصیل)جدید دور میں نمک منڈی روایتی پشاوری خوراک تکہ اور قیمتی پتھروں کی دکانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

۳۔ ڈبگری دروازہ

ڈبگری دروازہ فصیل شہر کے مغربی حصے پر واقع تھا۔ آج کل اس کا ایک ستون باقی ہے۔ اس کے نام کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہاں صندوق بنانے والے گاریگروں کی دکانیں تھیں۔ مقامی زبان میں صندوق کو''ڈبہ'' اور ''گری''بنانے کو کہتے ہیں۔ اس لئے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا نام ڈبگری پڑ گیا۔۱۲(A H Dani نمبر ۳۷) بازار کی ایک اور وجہ شہرت یہ ہے کہ یہاں موسیقی سے تعلق رکھنے والے لوگ بالاخانوں میں رہتے ہیں جن میں ہر قسم کے آلات موسیقی بجانے والے اور ناچ گانے والی رقاصائیں اور خواجہ سراء شامل ہیں۔ ڈبگری دروازے سے متصل ڈبگری بازار چارپائی،بان کی مصنوعات اور دیگر گھریلوں اشیاء کے لئے بھی مشہور ہے۔اس دروازے کے قریب انگریز دور کامشن ہسپتال بھی قائم ہے جو۱۸۵۹ء میں تعمیر کیا گیا۔۱۳(خاطر غزنوی نمبر۳۹)

سعدیہ صالح کو اس علاقے کے باشندے بابر نے اہم مسائل کچھ اس طرح بتا ئے:

> "یہاں پر گلیاں بہت تنگ ہیں جس کی وجہ سے گاڑیوں کی آمد ورفت میں لوگوں کو کافی مشکلات کا سامنا ہے اور ایک گھر کے آوازیں دوسرے گھر والے آسانی سے سنتے ہیں۔ اِس علاقے میں گھر پرانے زمانے کے ہیں جولکڑیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ جو بہت بوسیدہ اور خطرناک ہیں۔ 13-A"

اس سے آگے قدیم گرلز سکول''لیڈی گرفتھ سکول'' قائم ہے۔کسی زمانے میں یہاں خوبصورت پارک ہوا کرتا تھا جس کو ڈبگری گارڈن کہتے تھے مگر آبادی بڑھنے کی وجہ سے پارک میں مکانات اور مارکیٹیں وغیرہ تعمیر ہو چکے ہیں۔ آجکل یہ علاقہ ڈاکٹروں کے پرائیویٹ پریکٹس کے لئے مشہور ہے جہاں بلامبالغہ ہزاروں ڈاکٹر اپنے نجی کلینکوں اور درجنوں پرائیویٹ ہسپتالوں میں مریضوں کا علاج بھاری فیسوں کے عوض کرتے ہیں۔

۴۔ رامداس دروازہ

یہ دروازہ بھی شہر کی مغربی سمت میں واقع ہے۔ اس دروازے کا نام و نشان نہیں چونکہ اس دروازے کے پاس مشہور علاقہ بھانہ ماڑی واقع ہے اس لئے بعض لوگ اس کو بھانہ ماڑی دروازہ بھی کہتے ہیں۔۱۴ (گوپال داس نمبر۱۴)اس دروازے کے قریب مشہور تاریخی مقام کوٹلہ محسن خان واقع ہے۔ یہ ایک یادگار عمارت ہے جس میں دو گنبد اور ایک دروازہ شامل ہے۔ اس عمارت کے بانی کے بارے میں معلوم نہیں اگر چہ اسلامی تاریخ میں بہت ساری شخصیات محسن خان کے نام سے گزری ہیں۔ خیال بخاری کے مطابق کہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخصیت محبّ اللہ خان کو عمارت کی زمین مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے تحفتاً دی تھی۔محبّ اللہ خان کا ایک بیٹا پشتو زبان کا بہت بڑا شاعر تھا جن کا نام معض اللہ خان تھا۔معض اللہ خان کے چچا زاد بھائی کانام محسن خان تھا اور یہ کوٹلہ ان ہی کے نام سے مشہور ہوا البتہ یہ معلوم نہیں کہ یہ کوٹلہ اصل مالک کی بجائے ان کے بھتیجے کے نام سے کیسے موسوم ہوا ہے۔۱۵(رافعہ وحید نمبر۴۳)

محمد فاروق کو اس علاقے میں ایک رہائشی ملا جن کا خاندان بنیادی طور پر افغانستان سے آ کر یہا ں آباد ہواتھا۔ اس کا نام اسماعیل اور والد کانام عمرتاج تھا، آپ نے کہا:

"ہم یہاں افغا نستا ن سے آئے ہیں۔ یہا ں ہم پچھلے 90 سالو ں سے زند گی گزار رہے ہیں۔ بنیا دی طور پر مجھے اپنے ہجر ت کی اصل وجہ معلو م نہیں،کیو نکہ ہم بہت پہلے آئے ہیں۔ جو میں اپنے بزرگو ں سے سنتا آرہا ہو ں وہ روز گار کی تلا ش میں آنا تھا۔15-A"

کوٹلہ محسن خان سے کچھ فاصلے پر ڈھیری باغبانان کا علاقہ ہے جو کسی زمانے میں پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار کے لئے مشہور تھا۔ اس دروازے کی ایک اور تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہاں کے مغل گورنر ناصر خان نے افغانستان سے حملہ آور نادر شاہ کو ۱۷۴۱ء میں حملے کے دوران راستہ دیا تھا۔ پشاور شہر میں واقع چوک ناصر خان بھی غالبًا اس گورنر کے نام سے موسوم ہے۔

۵۔ سرآسیہ یا بے رسکان دروازہ

یہ دروازہ اس زمانے کے فصیل شہر کے جنوبی حصے میں بنایا گیا تھا۔ سر آسیہ کا مطلب پن چکی ہے چونکہ اس علاقے میں پن چکی واقع تھی۔ فارسی زبان میں آسیہ پن چکی کو کہتے ہیں جب کہ سر کا مطلب تھا اس سرا۔ اس دروازے کے دوسرے نام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں بڑی تعداد میں بے روزگار لوگ رہتے تھے جنہیں مقامی زبان میں''بے رزقان''یعنی بغیر رزق کے کہتے تھے اسی مناسبت سے اس کا ایک نام بے رزقان بھی پڑ گیا۔۱۶(خاطر غزنوی نمبر۴۵)تقسیم ہند سے قبل یہ علاقہ زیادہ تر ہندوآبادی پر مشتمل تھا اس دروازے کے اندر سخی شاہ مردان کا مزار بھی ہے۔سر آسیہ گیٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اسی دروازے کے باہر پشاور شہر کا مشہور دینی مدرسہ دارلعلوم سرحد واقع ہے۔

شازیہ ملک جو اس دروازے کے اندرونی حصے میں رہتی ہیں، سعدیہ کو اپنے ہاں کی رسوم و رواجوں کے بارے بتانے لگی:

> "اِس علاقے میں بھی باقی علاقوں کی طرح رسم و رواج ہیں اور پرانے زمانے میں یہاں کے لوگ دلہن کو ڈولی میں لاتے تھے اور دولہے کو گھوڑے پے لاتے تھے اور ایک پرانا رسم جو ہر دولہے کے ساتھ کیا جاتا تھا ڈولی لانے کے بعد دولہے کو اس کے دوست لے جا کے اس پہ ساتھ نلکوں کے پانی ڈالتے تھے۔ اب جب شادیاں ہالوں اور ہوٹلوں میں ہونے لگی ہیں تو یہ رسم معدوم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ 17-A"

۶۔ سرد چاہ دروازہ

یہ دروازہ ۱۹۰۳ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے نام کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں ٹھنڈے پانی کا ایک کنواں ہوا کرتا تھا جس کی مناسبت سے اس کو سرد چاہ کہا گیا۔ یہ کنواں بدھ مت کے دور میں کھودا گیا تھا۔[۱۷] (مجاہد اکبر نمبر۵۲) اس دروازے سے متصل مشہور محلّہ ''جوگن شاہ'' ہے جہاں کسی زمانے میں ہندومذہبی رہنما بھائی جوگا نے رہائش اختیار کی تھی جس کے سبب اس کو جوگن شاہ کہا جانے لگا۔یہاں آجکل سکھوں کی بڑی تعداد رہائش پذیر ہے۔ اس دروازے سے باہر شہر کی دوسری طرف وزیر باغ کی طرف راستہ جاتا ہے جب کہ اُسی جانب یکہ توت دروازہ بھی قائم ہے۔

اسی دروازے کے قریبی رہائشی علاقے کے باشندے بلال نے سیف اللہ کو علاقے کے مکینوں کو درپیش مسائل کا ذکر کچھ اس طرح کیا:

> " چھوٹے چھوٹے مسائل تو بہت زیادہ ہیں لیکن ٹریفک کا مسئلہ سب سے زیادہ گھمبیر ہے۔اس پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے ناک میں دم کر رکھا ہے میرے حساب سے ٹریفک کے بعد بجلی کی لوڈ شیڈنگ سب سے اہم مسئلہ ہے۔17-A"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۷۔ سرکی دروازہ

سرد چاہ دروازے کے بالکل قریب سرکی دروازہ واقع ہے یہ فصیل شہر کے جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس کے نام کے حوالے سے دوآراء پائی جاتی ہے۔مورخ گوپال داس کے مطابق کہ اس گیٹ سے متصل ایک سڑک گزرتی تھی جس کی مناسبت اسی کو''سڑکی'' یا ''سرکی''گیٹ کہا جانے لگا۔[۱۸](گوپال داس نمبر۱۴۳)

دوسری طرف مختار علی نیر کہتے ہیں کہ اس کو''شرقی''دروازہ کہتے تھے یہ نام بگڑ کر ''سرکی'' ہو گیا۔[۱۹](تمثیلا ریاض صفحہ نمبر58)سرکی گیٹ سے شہر کی دیوار آگے بڑھتی تو کوہاٹی دروازہ آتا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ شہروں میں لوگ بہتر معیار زندگی کے لئے منتقل ہوتے ہیں تو یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ پاکستان سٹڈی سینٹر پشاور یونیورسٹی کی طالبہ شبانہ نواب کو اس کام پر لگادیا گیا تھا کہ وہ سرکی دروازے کے علاقے میں نئے آنے والے یا ۱۹۷۰کے بعد دوسرے علاقوں سے آکر سکونت اختیار کرنے والوں کے حالات و اعداد و شمار جمع کریں، تو آپ کی ملاقات محمد اسلام سے ہوئی۔ اُنھوں نے بتایا:

> میں مردان سے پشاورمنتقل ہوا۔میں اور میرا خاندان پشاور شہر کے اس علاقے میں ۱۹۷۰ء سے رہ رہے ہیں۔ ہم مشترکہ کنبہ کے لوگ تھے۔ کچھ عرصے بعد میرے خاندان کے دوسرے لوگ مردان واپس جا کر آباد ہوئے جبکہ میں اپنے بچوں کی بہتر مستقبل بنانے کیلئے یہاں پر مستقل طور پر رہنے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ میرے بچے اچھی تعلیم حاصل کریں اور مجھے اچھی روزگار ملے۔ چنانچہ مجھے محکمہ پولیس میں نوکری ملی اور میرے سارے بچے اللہ کے فضل سے پڑھ لکھ گئے۔19-A"

۸۔ کوہاٹی دروازہ

یہ دروازہ شہر کے جنوب کی طرف کھلتا ہے۔ اس کا نام کوہاٹی اس لئے پڑگیا کہ یہ کوہاٹ کی طرف کھلتا تھا۔ یہ دروازہ ۱۹۴۱ء میں بنا۔[۲۰](A H Dani نمبر۵۹) اس درواز ے کے اندر''پری چہرہ''کامزار واقع ہے یہ خاتون نادرشاہ کی بیوی تھی جو ان کے ہندوستان پر حملے کے وقت پشاور میں وفات پاگئی تھی اور اس کو وہیں پر دفن کیا گیا تھا۔از(مختار علی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نمبر61) اس سے تھوڑا آگے سرداران پشاور کا بنگلہ تھا جس کو انگریزوں نے گراکرمشن سکول تعمیر کرایا تھا۔ تھوڑا آگے ایک بزرگ قاضی مظہر علی شاہ کا مزار بھی واقع ہے۔ کوہاٹی دروازے کے بیرونی جانب عیسائیوں کی بستی ہے۔

پشاور یونیورسٹی کی طالبہ مرینہ خان نے اس علاقے علاقے پر مرتب کردہ اپنی رپورٹ میں لکھا:

> "میں جب آگے بڑھی تو کوہاٹی گیٹ کے علاقے میں پہنچی۔ یہاں معلومات میں اضافہ ہوتا گیا پہلی بار ہندکو بولنے والے سے ایک اڈھیڑ عمر شخص سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے کام میں مگن تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہاں ہر پیشے سے تعلق رکھتے والے لوگ آباد ہیں۔زیادہ تر لوگ تقریباً کشمیر سے منتقل ہو کر یہاں رہائش پذیر ہوئے۔"[۲۲]

اختتامیہ

یہ تحقیقی مقالہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ راقم نے تاریخی حوالوں اور غیر شائع شدہ مواد سے استفادے کے علاوہ نہ صرف خود ان تمام دروازوں کا موقع پر جاکر براہ راست مشاہدہ کیا بلکہ طلباء و طالبات کی ایک ٹیم جنہوں نے پشاور کے فصیل شہر کا دورہ کیا تھا، ان کی رپورٹوں سے بھی بعض تفصیلات کو مقالے کا حصہ بنایا۔ اگرچہ دورِ جدید میں شہروں سے فصیل اور دروازں کا رواج ختم ہوگیا ہے لیکن لگتا ہے کہ ان کی ضرورت اب بھی ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ اُصول اپنا یا جائے کہ جہاں بھی نیا شہر بسایا جائے گا اس کے فصیل سے باہر کسی قسم کی آبادی کی اجازت نہیں دی جائیگی تو اس سے شہروں کے بے ڈھنگے پھیلاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ہمارے ہاں امن و امان کی صورت حال اب بھی بہتر نہیں اس لئے فصیل شہر اور دروازے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں تین مثالیں دی جا سکتی ہیں: اول یہ کہ ۱۹۹۰ کی دہائی سے کراچی میں امن و امان کی صورت حال خراب ہونے کی وجہ سے وہاں بہت سارے سول اور ملٹری مقامات پر فصیلیں اور دروازے بنائے گئے ہیں۔ دوسری مثال پشاور کی چھاونی کا علاقہ ہے جہاں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے بعد امن امان کی ابتر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورتِ حال کے بعد کینٹ کے اندر جانے والی اکثر سڑکوں کو بند کر کے اُن کے داخلی راستوں پر گیٹ لگائے گئے ہیں۔ تیسری مثال پشاور یونیورسٹی کیمپس کی ہے یہ یونیورسٹی۱۹۵۰ میں اپنے قیام سے لیکر ۱۹۸۵ تک بغیر چاردیواری اور دروازوں کے کام کر رہی تھی۔ اُسی سال اس کے ارد گرد فصیل تعمیر کر کے چاروں اطراف پر دروازے نصب کئے گئے ہیں۔ان مثالوں سے تو ثابت ہوتا ہے کہ فصیل اور دروازوں کا احیاء نئے انداز سے ہورہا ہے۔

درج بالا مثالوں کے علاوہ، پورے ملک، خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں میں یا تو پرانے دروازوں کو بحال کیا جا رہا ہے، یا پھر نئے دروازے تعمیر کئے جارہے ہیں۔ لاہور اور پشاور میں پرانے دروازوں کو بحال کرنے کے علاوہ ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں، کوہاٹ،مردان، سیالکوٹ،ہزارہ فاٹا کی کئی ایجنسیوں اور دیگر چھوٹے بڑے مقامات میں نئے دروازے بن رہے ہیں۔

پشاور کے سولہ دروازوں میں سے اکثریت دوبارہ تعمیر کئے گئے ہیں جبکہ جو باقی ہیں اُن کی تعمیر نو اور بحالی کے لئے منصوبہ بندی ہورہی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ فصیل شہر اور دروازوں کی تاریخ کی تدوین کے ساتھ ساتھ اگر اُن کو بحال کیا جائے تو اس سے نہ صرف ہمارا ورثہ محفوظ ہوجائے گا بلکہ امن و امان اور شہروں کے پھیلاو کے مسئلے بھی حل ہوجائیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ بی بی سی اُردو ویب سائٹ۔۱۶ دسمبر۔۲۰۱۶

۲۔ شفیع صابر۔ *تاریخِ صوبہ سرحد*۔ یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور۔۱۹۸۵، صفحہ ۵۰۵

۳۔ ایضاً

۴۔ دیکھیں Shagufta Shaheen, *Qila Balahisar,* MA Thesis submitted to Pakistan Study Centre, University of Peshawar, 1996, p.44

۵۔ بی بی سی۔ ایضاً

۶۔ دیکھیں Syed Abdul Qudoos, *The North West Frontier of Pakistan,* Royal Book Company, Karachi, p. 189

۷۔ دیکھیں: Fakhr-ul-Islam, *Khyber Pakhtunkhwa: Apolitical History*

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(1901-55), National Institute of Historical and Cultural Research Quaid-e-Azam University, Islamabad, 2014

۸۔ دیکھیں Zahid Zafar, *Peshawar Under the British Rule (1849-1947),* doctoral thesis submitted to Area Study Centre University of Peshawar, 1998, p. 2

۹۔ دیکھیں Tamseela Riaz, *The Gates of the Walled City of Peshawar,* MA Thesis submitted to Pakistan Study centre, University of Pesawar, Session 1996-98. p. 46

۹۔ اے شبانہ نواب پاکستان سٹڈی سینٹر کی غیر مطبوعہ رپورٹ

۱۰۔ گوپال داس، *تاریخِ پشاور*، کوہ نور پبلیکیشنز، لاہور، صفحہ۳۴

10A۔ ماریہ کا انٹرویو انیس الرحمان کے ساتھ، باجوڑی گیٹ پشاور

11- Fakhr-ul-Islam, op.cit.

۱۲۔ احمد حسن دانی، صفحہ 73

۱۳۔ خاطر غزنوی، *سولہ دروازوں کا شہر، پشاور*۔ غیر مطبوعہ مضمون

13A۔ بابر کا انٹرویو سعدیہ صالح کے ساتھ ڈبگری دروازہ

۱۴۔ گوپال داس صفحہ نمبر ۳۴۱

۱۵۔ دیکھیں Rafia Waheed " *Mughul Buildings of Peshawar"* BS thesis submitted to College of Home Economics University of Peshawar, 1992, p. 35

15A۔ اسماعیل کا فاروق کے ساتھ انٹرویو، رامداس بازار پشاور شہر

۱۶۔ خاطر غزنوی، غیر مطبوعہ مضمون

۱۷۔ شازیہ کا انٹرویو محمد فاروق کے ساتھ۔ بے رزکاں دروازہ پشاور شہر

17A۔ بلال کا انٹرویو سیف اللہ کے ساتھ۔ سرد چاہ دروازہ پشاور شہر

۱۸۔ گوپال داس، صفحہ نمبر ۱۴۴

۱۹۔ دیکھیں TamsilaRiaz, p. 58

۲۰۔ دیکھیں Dani, p. 167 AH

۲۱۔ مختیار علی نیر، *ہندکو لوک کہانیاں*، سلیمان پرنٹرز پشاور۔ ۱۹۷۷،صفحہ۲۲

۲۲۔ مرینہ خان کی غیر مطبوعہ رپورٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور اکیسویں صدی

ڈاکٹر صوفیہ یوسف*

Abstract

The invention of computers and advent of Information Technology has transformed this vide planet into a global village. This transformation has adversely affected the philosophies of past. Sir Syed had laid the foundations of Muslims Educational conference in 1886 to promote education and reforms among Muslims of India. The aims and objectives of this conference were set and truly pursued. This conference brought positive change in our society and created vibrant and educated youth that culminated in achievement of Pakistan in 1947. After independence this message was further propagated to create reformed, improved and balanced society in the newly created country. This still continues to play its effective role.

This paper investigates in detail the importance, need and worth of pursuit of aims, and objective of Muslims Educational conference in 21st century.

تلخیص

کمپیوٹر کی ایجاد اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے ہمارے کراہ ارض کو گلوبل ولیج میں تبدیل کردیا ہے، جس کی وجہ سے دنیا بھر کے اکثر فلسفیوں کی نظریات پائیدار اور مفید نہیں رہے

* چیئرپرسن، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن سرسید کی فکر آج بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔سرسید نے ۱۸۸۶ء میں اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے دائرہ کار کو پورے برِصغیر میں پھیلانے کے غرض سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی اور اپنے رفقا کے صلح و مشورے کے بعد اس کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کی۔ ۱۹۴۷ء تک یہ کانفرنس بھرپور طریقے سے برِصغیر میں متحرک رہی اور معاشرے میں مثبت تبدیلی اور سوچ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد نئی سوچ اور نئے انداز سے مختلف سیاسی، سماجی، مذہبی انہیں معاشرتی اصلاح کے لئے کام کررہی ہیں۔ آج اکیسویں صدی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے کیا اہمیت ہے؟ اور کیوں ؟ یہ مقالہ اس سوال کے مفصل جواب پر مشتمل ہے۔

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں کمپیوٹر کی ایجاد نے انسان کی شعوری ترقی کے لئے نئی راہیں ہموار کیں۔ کمپیوٹر کی جدید ترقی یافتہ صورت انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صورت میں سامنے آئی اور یہ اس ہی ایجاد کا کمال ہے کہ ہمارا کراہ ارض اب ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہوگیا ہے۔ آج ہم اپنے گھروں یا آفس میں بیٹھے بیٹھے میلوں دور ہونے والی تبدیلیوں اور واقعات سے سیکنڈوں میں آگاہ ہوجاتے ہیں۔معلومات کی اس تیز رفتار ترسیل نے صدیوں پر انے نظریات کو رد بھی کیا اور نئے نظریات کی بنیاد بھی رکھی۔ کچھ نظریات ایسے بھی ہیں جن کو اس ایجاد سے تقویت ملی۔ جیسے'' تعلیم اور اس کے ذریعے سوسائٹی میں مثبت تبدیلی'' کا سرسید کا فلسفہ آج بھی ہر لحاظ سے اہم اور قوموں کے دوام کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال اور اس سے مثبت انداز میں فیض یاب ہونے کے لئے تعلیم کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔ آج دنیا میں وہی قومیں ترقی یافتہ اور طاقت ور ہیں جو تعلیم تحقیق و ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے ہیں۔

اگر ہم ماضی قریب پر ناقدانہ نظر ڈالیں تو متحدہ ہندوستان (British India)میں 1881 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں خواندگی کی شرح 1.2 فی صد تھی یعنی ایک ہزار میں صرف 35 اشخاص لکھ پڑھ سکتے تھے اور ان میں مسلمانوں کا تناسب .1 فی صد تھا۔ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو انیسویں صدی کے اہم سوشل ریفارمر،مفکر، ماہر تعلیم اور قوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و ملت کے ہمدرد سرسید احمد خاں نے سمجھا اور اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:۔

> ’’میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشایستہ ان میں نہایت دلیری اور جرات پاتا ہوں پر خوفناک ان میں نہایت قومی استدلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان کو نہایت دانا اور عقل مند پاتا ہوں پر اکثر مکرو فریب اور زور سے ملے ہوئے۔۔۔ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم تربیت سے آراستہ ہوجائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں‘‘۔[۱]

اس طرح انھوں نے تعلیم کے میدان میں اپنی قوم کو وقت اور زمانے کے بدلتے حالات کے ساتھ چلنے کی ترغیب دیتے ہوئے اپنے قلم اور عمل سے کئی منصوبوں کا آغاز کیا۔ ان منصوبوں میں سے ایک اہم منصوبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (1886ء) کا قیام بھی تھا۔

یہ مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ انجمن تھی جس کا ایک خاص قانون اور دستور العمل بھی واضح کیا گیا۔ کانفرنس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر کرنا اور ان کو سیاست کے گورکھ دھندے سے دور رکھتے ہوئے تعلیمی میدان میں ترقی کی راہ پرگامزن کرنا تھا۔کانفرنس کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سرسید نے فرمایا کہ:۔

> اے صاحبو! جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی سمجھتا ہوں۔[۲]

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بنیادی طور پر مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لئے قائم کی گئی تھی اس لیے اس کی توجہ تعلیمی مسائل کی طرف مرکوز رہی۔(۳) آج اکیسویں صدی میں بھی سرسید کی فکر کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں آج بھی مسلمانوں کو جدید دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملاکر چلنے اور درپیش چیلینجز کا مقابلہ کرنے کے لئے تعلیمی میدان میں کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ:۔

۱۔ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف مائل کرنا

۲۔ ان کے ماضی کے سرمایے کو محفوظ کرنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ ان (مسلمانوں) کے معاشرے میں اصلاحی اقدام کرنا

کانفرنس نے نہ صرف ملی ترقی اور اتحاد کے جذبات پیدا کیے بلکہ اس نے مسلمانان ہند کو ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جس کی حیثیت کل ہند تھی اور جس میں ہر فرقے اور ملک کے ہر حصے کے لوگ مختلف عقائد رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے شریک ہوئے اور ایک مشترکہ مقصد کے حصول کی جدوجہد میں لگ گئے تھے کانفرنس کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ بحیثیت ایک ادارہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے علمی اقدام اٹھائے بلکہ اس کا مقصد تو مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا اور اس سلسلے میں ان کی مدد کرنا تھا۔اس سلسلے میں کانفرنس قرار دادیں منظور کرتی تھی اور ان منظور شدہ قرار دادوں کی حمایت میں کانفرنس کا مرکزی دفتر اور عہدیداران کو شاں رہتے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر خطوط لکھے جاتے، وفود بھیجے جاتے اور جلسوں میں تقاریر ہوتیں، تجاویز منظور کی جاتیں اور ان اقدامات پر کلی یا جزوی کامیابی بھی حاصل ہوتی تھی۔

مسلمانانِ ہند کی تعلیمی ترقی کے ساتھ کانفرنس کے مقاصد میں مغربی علوم وفنون کی اسلامی روایات کے ساتھ اشاعت علوم اسلامیہ کی تحقیق جدید اور مسلمانوں میں اصلاحی ترقی بھی شامل تھے۔مکتبوں کے فروغ اور اصلاح کے لئے ہر ضلع میں کمیٹیاں قائم کیں جن کے سپرد مکاتب کی نگرانی کا کام تھا۔ (۴) کانفرنس کی کوششوں سے حکومت ہندنے ایک سرکولر ضلع کی لوکل حکومتوں کے نام جاری کیا۔ جس کے چھ نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ مکتبوں کو ترغیب دی جائے کے وہ اردو اور قرآن شریف کی تعلیم دیں۔

۲۔ جن مقامات پر عملی کاموں میں اردو رائج ہو وہاں پر اردو کی تعلیم میں آسانیاں بہم پہچائی جائیں۔

۳۔ مکتبوں کے واسطے خاص نصاب تیار کیا جائے۔

۴۔ نصاب میں اردو ریڈروں کے مضامین میں مسلمانی روایات کو شامل کیا جائے ان اندرجات کو خارج کیا جائے جن کو مسلمان پسند نہیں کرتے ہوں۔

۵۔ جہاں کہیں قابلِ عمل ہو مسلمان استار مقرر کیے جائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے علاحدہ انسپکٹنگ ایجنسی قائم کی جائے۔۵

کانفرنس کے قیام (1886ء) کے بعد اس کے سالانہ جلسے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں ہوتے رہے۔ صوبائی شاخیں پورے ملک میں قائم کی گئیں اور کانفرنس کی کوشش سے علی گڑھ مسلمانوں کا تعلیمی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ ثانوی تعلیم کے متعلق کانفرنس کے دونظریے تھے۔ پہلا گورنمنٹ ہائی اسکولوں اور مڈل اسکولوں میں زیادہ سے زیادہ مسلمان طالب علموں کا داخلہ دوسرا اس قسم کے غیر سرکاری مدارس کی اصلاح اور ترقی، نیز جہاں ضرورت ہو اس طرح کے مدارس کا قیام۔۶ کا نفرنس نے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی ثانوی تعلیم کا جائزہ لیا اور صوبائی کانفرنس قائم کیں۔ تاکہ مقامی ضرورتوں کے پیش نظر رکھتے ہوئے وہاں کی حکومت سے امداد حاصل کرسکیں۔۷

کانفرنس نے صرف مدارس کے قیام کی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں طلبہ کی اقامت گاہوں کا بھی انتظام کیا۔ چنانچہ سورت میں ایک بورڈنگ ہاؤس کے قیام کے لئے ہزاروں روپے کا چندہ کرکے طلبہ کی اقامت کے مسئلے کو حل کیا۔۸ کانفرنس نے ثانوی مدارس کے نصابات، طریقہ تعلیم، امتحانات اور غیر نصابی مشاغل جیسے مسائل کی طرف بھی توجہ کی۔ اس سلسلے میں ۱۹۲۳ء کی یہ تجویز بھی قابل ذکر ہے کہ جملہ اسلامی درسگاہوں میں بتدریج بوائے اسکاوٹ کی تحریک رائج کی جائے۔۹ یہ اس کانفرنس کی مسلسل و متواتر جدوجہد اور تحریکات کا نتیجہ تھا کہ مسلمانان ہند جدید تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔

کانفرنس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1886ء میں جب یہ تحریک شروع ہوئی تھی تو اس وقت ہندوستان میں صرف 44 مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے تھے ان میں 20 علی گڑھ کے طالب علم تھے۔۱۰ اور یہ کانفرنس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ:

۱۔ علی گڑھ میں (1920ء) مسلم یونی ورسٹی کا قیام۔

۲۔ علی گڑھ میں مسلم خواتین کے لئے ڈگری کالج کا قیام۔

۳۔ ملک کے مختلف حصوں میں مسلم کالجوں اور اسلامیہ درسگاہوں کا قیام۔

۴۔ انجمن ترقی اردو کا قیام۔

© rasailojaraid.com